۱۰

زرد پتّوں کی بہار

رام لعل

پیش درس

سفرنامہ اُردو ادب کی ایک مقبول صنف ہے۔ ہر سفر ایک خاص تجربہ ہوتا ہے۔ اگر کسی شخص میں اس تجربے کو بیان کرنے کی صلاحیت ہوتو ایک دلچسپ سفرنامہ لکھا جاسکتا ہے۔ پرانے زمانے میں جب مسافر سفر سے واپس آتے تو اپنے تجربات کی روداد دوستوں اور عزیزوں کو سناتے تھے۔ اُردو نثر کی ترقی کے ساتھ ہمارے ادبی سرمائے میں کئی صنفوں کا اضافہ ہوا۔ سوانح نگاری، خودنوشت، تنقید، انشائیہ اور سفرنامہ، نثر کی نسبتاً جدید ترین اصناف ہیں۔

سفرنامے کے مطالعے سے ہمیں دور دراز کے ملکوں، تہذیبوں اور جغرافیائی حالات سے آگاہی ملتی ہے۔ بہت سے انوکھے کرداروں سے بھی اس سفر میں ملاقات ہوجاتی ہے۔ سفرنامہ ہمارے لیے دنیا کے مختلف علاقوں سے تعارف کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس کے مطالعے سے ہماری عام معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ ہم گھر بیٹھے بڑی بڑی مہمیں سر کرلیتے ہیں اور ایسے علاقوں تک جا پہنچتے ہیں جہاں جانا ہمارے لیے آسان نہیں ہوتا۔ اس لحاظ سے سفرنامے کو سفر کا بدل بھی کہا جاسکتا ہے۔

اُردو کا پہلا سفرنامہ یوسف خاں کمبل پوش کا 'عجائباتِ فرنگ' ہے۔ یوسف خاں نے ۱۸۳۷ء میں کلکتے سے بحری جہاز سے انگلستان کا سفر کیا تھا۔ ان کا قیام لندن میں تھا جہاں کی آب و ہوا، نئی نئی ایجادات اور باشندوں کا ذکر انھوں نے نہایت دلچسپ انداز میں کیا ہے۔

سرسیّد احمد خاں کے سفرنامے 'مسافرانِ لندن' کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔ سرسیّد کے معروف معاصرین میں محمد حسین آزاد کا سفرنامہ 'سیرِ ایران' اور مولانا شبلی نعمانی کا 'سفرنامۂ روم و مصر و شام' بھی اہمیت رکھتا ہے۔ بیسویں صدی کے سفرناموں میں منشی محبوب عالم کے دو سفرنامے 'سفرنامۂ یورپ' اور 'سفرنامۂ بغداد' اور قاضی عبدالغفار کا سفرنامہ 'نقشِ فرنگ' بہت مقبول ہوئے۔ خواجہ احمد عباس کا سفرنامہ 'مسافر کی ڈائری'، پروفیسر احتشام حسین کا 'ساحل اور سمندر'، قرۃ العین حیدر کا 'جہانِ دیگر' اور 'شاہراہِ حریر' اور مستنصر حسین تارڑ کے بہت سے سفرناموں کی اپنی اہمیت ہے۔ اُردو میں چند مزاحیہ سفرنامے بھی لکھے گئے ہیں جن میں ابنِ انشا، شفیق الرحمٰن اور مجتبیٰ حسین کے سفرنامے قابلِ ذکر ہیں۔

مختلف ملکوں میں آمد و رفت وہاں کے باشندوں میں محبت اور یگانگت کے جذبات پیدا کرتی ہے۔ بھارت اور پاکستان میں بہت سے افراد ایک دوسرے کے رشتے دار ہیں۔ اس وجہ سے ان ملکوں میں لوگوں کا آنا جانا عام ہے۔ دونوں ملکوں کے ادیب اور شاعر بھی ثقافتی و تہذیبی لین دین کے مقصد سے ایک دوسرے کے ملکوں کا سفر کرتے ہیں۔ رام لعل کا سفرنامہ 'زرد پتوں کی بہار' اسی سلسلے کی کڑی ہے۔

ملک کی تقسیم کے بعد ایک شخص جو اپنا وطن چھوڑ کر دوسری جگہ جا بستا ہے، اسے دوبارہ اپنے آبائی وطن کی یاد کس طرح بے چین کرتی ہے اور اسے ایک بار پھر وہاں جانے کا موقع ملتا ہے تو اس کی کیا کیفیت ہوتی ہے اس کا اظہار اس سفرنامے میں بخوبی کیا گیا ہے۔

جان پہچان

رام لعل اُردو کے مقبول افسانہ نگار ہیں۔ وہ ۱۹۲۳ء میں مغربی پنجاب کے شہر میانوالی میں پیدا ہوئے۔ لاہور میں انھوں نے تعلیم حاصل کی اور وہیں ریلوے میں ملازم ہوگئے۔ ملک کی تقسیم کے بعد وہ ہندوستان آگئے اور یہاں بھی ریلوے میں ملازمت کرلی۔ ان کے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہوچکے ہیں۔ رام لعل نے دو سفرنامے 'خواب خواب سفر' اور 'زرد پتوں کی بہار' بھی لکھے۔ پہلا یورپ کے سفر کی روداد ہے اور دوسرے میں پاکستان کے سفر کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔

رام لعل کا دوسرا سفرنامہ اس اعتبار سے بہت انوکھا ہے کہ یہ سفر مصنف نے نئی دنیا کی دریافت کے لیے نہیں بلکہ اپنی پرانی یادوں کو تازہ کرنے کے لیے کیا تھا اس لیے اس سفرنامے میں ماضی اور حال ایک دوسرے سے گلے ملتے نظر آتے ہیں۔ وہ جب کسی جگہ کسی عمارت کو دیکھتے ہیں یا کسی شخص سے ملتے ہیں تو اس کے حوالے سے انھیں اپنے لاہور کے دنوں کی یاد آنے لگتی ہے۔

رام لعل کو سفرنامہ نگار کی حیثیت سے اپنے مشاہدات اور تجربات کو مناسب الفاظ میں پیش کرنے کا فن آتا ہے۔ ان کی نثر بہت سادہ اور رواں ہے۔

میں جب واہگہ کے راستے ۸؍فروری ۱۹۸۰ء کو ریل کے ذریعے لاہور کی طرف بڑھ رہا تھا تو میرے دل میں کئی طرح کے وسوسے تھے۔ میں وہاں کیوں جا رہا ہوں؟ وہاں تو اب میرا کوئی سگا سمبندھی بھی نہیں رہتا۔ پاکستان سرکار نے ۱۹۷۸ء میں ایک بار میری ویزا کی درخواست مسترد کر دی تھی۔ اب دوسری بار درخواست دینے پر اچانک منیر احمد شیخ نے جو ہندوستان میں پاکستانی سفارت خانے میں پریس کونسلر ہیں، مجھے یہ کہہ کر ویزا دلوا دیا کہ موجودہ حکومتِ پاکستان دونوں طرف کے عوام میں محبت اور دوستی کے جذبات کو بڑھانا چاہتی ہے۔ اب میں اپنے قلم کے رشتے داروں سے ہی ملنے کے لیے وہاں جا رہا ہوں، جن میں سے بیشتر کی کتابیں مجھے ملتی رہی ہیں۔ جن کے رسالوں میں مَیں چھپتا رہا ہوں اور جن کے خدوخال ان کی تخلیقات سے پہچانتا ہوں۔ ان میں سے کئی ایک نے اکثر مجھے اپنے یہاں آنے کی دعوت دی ہے۔

میں میاں والی میں پیدا ہوا تھا۔ نقلِ مکانی مجھے وراثت میں ملی ہے۔ اب میں عارضی طور پر اس جگہ کی طرف لوٹ رہا ہوں جہاں میرے کئی بزرگوں اور عزیزوں نے آخری سانسیں لی تھیں۔ جس مکان میں میری ماں نے جان دی تھی اور جس کی شکل بھی مجھے یاد نہیں ہے۔ کیونکہ تب میں صرف دو اڑھائی سال کا تھا اسی مکان میں اسے پھر سے تلاش کروں گا۔ میں بھی اسی مکان میں پیدا ہوا تھا۔ لاہور میں جوان ہوا تھا اور وہاں سے میں جوان ہو کر آیا تھا۔ اب چھپن برس کی عمر میں وہاں لوٹ رہا ہوں۔ میرے بچپن اور بڑھاپے کے درمیان عمر کا یہ فاصلہ کس قدر طویل ہو گیا تھا، جو اَب ریل کی رفتار کے ساتھ لحہ بہ لحہ سمٹتا جا رہا ہے، کم ہوتا جا رہا ہے۔ اسی فاصلے کو میں نے بے شمار مرتبہ خوابوں کی مدد سے آناً فاناً لانگھا ہے۔ خوابوں کے سامنے سرحدیں اور فاصلے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ میں اپنے ماضی کے ساتھ اس لیے ابھی تک جڑا رہا ہوں کہ وہ میرے خوابوں میں اپنی اصلی حالت میں ابھی تک موجود ہے۔ میں نے اتنا عرصہ خوابوں کے ساتھ جینا سیکھا ہے۔ میں نے اپنے ماضی کو بھلانے کی کبھی کوشش کی تو یہ اچانک میری کسی نہ کسی کہانی میں گھس کر بیٹھ گیا۔ ماضی انسان کی پہچان بن جاتا ہے۔ یہ نہ ہو تو وہ بالکل اجنبی بن جائے۔ کسی دوسری ہی دنیا کا انسان جس کے پاؤں زمین کے ساتھ نہیں لگے ہوں گے۔ ماضی ہماری زمین ہے اور زمین ہی کے ساتھ ہم نے ہمیشہ گہرا رشتہ قائم رکھا ہے۔

میں اچانک ماضی کی بھول بھلیوں سے نکل کر لاہور کے مضافات میں پھیلے ہوئے کھیتوں، اینٹوں کے بھٹّوں، چھوٹے چھوٹے قصباتی مکانوں اور چھوٹی چھوٹی مسجدوں کے مناروں کے درمیان پہنچ جاتا ہوں۔ میں محسوس کرنے لگتا ہوں میرے نتھنوں میں جو تازہ ہوا آ رہی ہے وہ میری جانی پہچانی سی ہے۔ میں اس کی خوشبو سونگھ کر بتا سکتا ہوں کہ یہ میرے لاہور سے آ رہی ہے۔ پنجاب کے اس حصے سے آ رہی ہے جسے میں کبھی بھلا نہیں پایا۔ میں ٹرین کی کھڑکی میں سے بڑی خاموشی سے تیزی سے گزرتے ہوئے واچ ٹاوروں اور اونچی اونچی گھاس اور مٹی میں چھُپے ہوئے پل باکسوں کی طرف دیکھتا ہوں۔ اب تو یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ صرف ہوا ہے اور دھوپ ہے۔ خوشبو ہے اور کھیتوں میں ہر طرف اُگے ہوئے سنہری گندم کے لہلہاتے ہوئے خوشے ہیں اور ریل کی پٹری کے متوازی دوڑتی ہوئی ایک سڑک ہے جس پر دو جاپانی کاریں آگے پیچھے دوڑ رہی ہیں اور ایک جوہڑ کے سامنے کئی بھینسیں بیٹھی ہوئی ہیں جن کی طرف ذرا فاصلے پر ایک چھکڑے کے پہیے کے ساتھ بندھا ہوا ایک اونٹ فلسفیوں کی سی گمبھیرتا سے ایک ٹک دیکھ رہا ہے اور ایک پیڑ کے نیچے ایک گبرو لیٹے لیٹے بانسری بجا رہا ہے اور ایک مکان کے آنگن کی دیوار پر کوئی دوشیزہ دھوپ میں سوکھتے ہوئے رنگین کھیس کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتے دیکھتے اچانک گاڑی کی طرف متوجہ ہو گئی ہے۔

پھر میری نظروں کے سامنے مغل پورہ ورکشاپ کے شیڈوں کے چمکتے ہوئے ٹین اُبھر آتے ہیں۔ یہیں کہیں میں پانچ سال تک بطور اپرنٹس خراد مشین کا کام سیکھتا رہا تھا۔ ریل کا شور اچانک بڑھ گیا ہے۔ اب گاڑی یارڈ میں داخل ہوگئی ہے۔ دونوں طرف مال گاڑیوں کا سلسلہ ہے جس سے نکلتے ہی اچانک مجھے لاہور کا سائن بورڈ دِکھائی دے جاتا ہے اور گاڑی پلیٹ فارم پر پہنچ کر رک جاتی ہے۔ اس ڈبے میں میرا ہم سفر علی عباسی حسینی مرحوم کا ایک رشتے دار ہے جسے کراچی جانا ہے۔ وہ اور میں دونوں کتنی دیر سے خاموش ہیں۔

میں پلیٹ فارم پر اُتر جاتا ہوں۔ پلیٹ فارم پر چل کر محسوس کر رہا ہوں، مَیں واقعی زمین پر ہوں۔ یہ خواب نہیں ہے۔ جو خواب تھا وہ اب پورا ہو چکا ہے۔ قلی سامان اُٹھا کر آگے آگے بھاگ رہے ہیں۔ گاڑی کے ہر ڈبے سے سیکڑوں لوگ اُبل سے پڑے ہیں۔ بمبئی، حیدر آباد، مدھیہ پردیش، بہار اور یوپی کے لوگ مرد، عورتیں اور بچّے۔ سفر کی گرد سے اَٹے ہوئے اور پریشان اور حواس باختہ کچھ عورتیں جلدی جلدی اپنے برقعے پہن رہی ہیں۔ ایک لڑکے کے ہاتھ میں کرکٹ کا بَلّا ہے۔ ایک لڑکی اپنے بیگ میں جلدی جلدی 'فلم فیئر' ٹھونس رہی ہے۔ اسے وہ کسٹم والوں کی نظر سے بچا کر اپنی ہندوستانی فلموں کی شوقین فرینڈز تک لے جانا چاہتی ہے۔

جہاں قلی نے لے جا کر میرا سامان ایک طرف رکھ دیا تھا، وہاں پاسپورٹ چیک کرانے والوں کی بھیڑ دیکھ کر میں گھبرا جاتا ہوں۔ یہاں تو کئی گھنٹے اپنی باری آنے میں لگ جائیں گے۔ کسٹم کے پاکستانی عملے کی طرف میں بڑی خاموشی سے دیکھتا ہوں۔ یہ سب لوگ خوب صورت اور اسمارٹ ہیں۔ سب پنجابی ہی بولتے ہیں۔ قلی بھی پنجابی بولتے ہیں۔ لال لال وردیوں کے نیچے نیشنل ڈریس بھی پہنے ہوئے ہیں۔ یک رنگی شلوار اور قمیص، شکل وصورت سے قلی نہیں لگتے۔ میں خود کو پنجابی بولنے کے لیے آمادہ کر کے ایک آدمی کو روک کر پوچھتا ہوں، ''اِتھے ریسیو کرن آن والے لوگ تاں باہری کھڑے رہندے نیں؟''

بھیڑ میں اچانک میرے سامنے ڈاکٹر احراز نقوی کا چہرہ اُبھر آتا ہے۔ وہ جلدی سے میرے ہاتھ سے پاسپورٹ اور ویزا لے کر کسٹم والوں کی طرف چل دیتا ہے۔ وہ بھی دوسرے مسافروں کی طرح گھبرایا ہوا ہے۔ اس کی گھبراہٹ پر میں مسکرا دیتا ہوں اور پھر میرے سامنے تین اور مسکراتے ہوئے چہرے آجاتے ہیں؛ ڈاکٹر آغا سہیل، طاہر تونسوی اور ابصار عبدالعلی۔ احراز کی طرح آغا سہیل اور ابصار بھی لکھنؤ کے ہیں۔ ان تینوں کو میں ان کے بچپن سے جانتا ہوں۔ وہ ہماری ادبی محفلوں میں ہی جوان ہوئے ہیں اور اب لاہور کی محفلوں میں جگمگا رہے ہیں۔ طاہر تونسوی پچھلے سال ڈاکٹر مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم پر ریسرچ کرنے کے لیے لکھنؤ آیا تھا اور دو مہینے وہاں رہا تھا۔ ان کے ساتھ بشیر بھی تھے؛ طاہر رضا زیدی کا ڈرائیور۔ وہ سب میرے سامان کا ایک ایک نگ اٹھا کر بھیڑ میں گھستے چلے جاتے ہیں، ایک پوسٹ سے دوسری پوسٹ پر۔ وہ وہاں کسی نہ کسی کو ضرور جانتے ہیں۔ ان سے مجھے بھی متعارف کراتے جاتے ہیں۔ رام لعل کا افسانہ نگار ہونا جیسے کوئی اہم بات ہو! سب لوگ ہاتھ ملا کر مسکراتے ہیں اور مجھے آگے بڑھ جانے کے لیے کہتے ہیں۔ اچانک ایک ٹکٹ کلکٹر مجھ سے ٹکٹ طلب کرتا ہے۔ امرتسر سے لاہور تک کا اور میں اچانک یاد کر کے بتاتا ہوں، ''ٹکٹ تو میں نے لیا ہی نہیں تھا۔ میں تو ریلوے کا ملازم ہوں، آپ ہی کی طرح۔'' وہ مسکرا کر مجھے جانے دیتے ہیں۔

''اب تم لاہور میں ہو! اپنے لاہور میں!'' آغا سہیل مسکرا رہا ہے۔

''میں نے یہاں سے آخری بار تنخواہ لی تھی ۶/اگست ۱۹۴۷ء کو۔'' میں اسی پلیٹ فارم پر بنے ہوئے کیش آفس کی طرف اشارہ کر کے بتاتا ہوں۔

’’اور میں اسی پلیٹ فارم سے کالکا میل سے جالندھر کے لیے روانہ ہوا تھا۔‘‘

لاہور اسٹیشن کے باہر دو کاریں موجود ہیں۔ ایک تو ابصار عبد العلی کی تھی۔ دوسری طاہر رضا زیدی نے بھجوائی تھی۔ وہیں پر کراچی سے آئے ہوئے راحت سعید اور ’واہ سیمنٹ فیکٹری‘ کے محمد حسن عسکری بھی موجود تھے۔ ان دونوں سے میرا پہلی بار تعارف ہوا۔ راحت سعید، پی آئی اے میں ٹیکنیکل منیجر ہیں اور اکثر مختلف ملکوں میں گھومتے رہتے ہیں۔ وہ میری خاطر رُک گئے تھے اور اسی شام کو کراچی جانے کا پروگرام بنا چکے تھے۔ ایک شام پہلے اُردو کے منفرد نقاد محمد علی صدیقی کو ایک بہت ضروری کام سے واپس کراچی جانا پڑ گیا تھا لیکن وہ معذرت کے ساتھ ساتھ یہ بھی پیغام چھوڑ گئے کہ اب وہ میرا استقبال کراچی ہی میں کریں گے۔

اچانک آغا سہیل نے مجھ سے پوچھا، ’’لاہور کو کچھ بدلا ہوا پایا؟‘‘

میں نے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں جو بلا شبہ ایک ذہین کہانی کار کی آنکھیں تھیں، مجھ پر ٹکی ہوئی تھیں اور میری حیرت سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ وہ بھی تو لکھنؤ کی گلیوں سے کٹ چکا تھا۔ چند ماہ پہلے آیا تھا تو وہ بھی تو وہاں اپنے کھوئے ہوئے نشان تلاش کرتا پھرتا تھا۔ کہاں بیٹھ کر وہ دوستوں کے ساتھ چائے پیا کرتا تھا۔ یونیورسٹی جانے کے لیے وہ کون کون سی گلیوں سے ہو کر نکلتا تھا۔ تب وہ لکھنؤ آزادی سے پہلے کا تھا اور اپنی ساری روایات اور پورے آب و تاب کے ساتھ موجود تھا۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے جواب دیا، ’’بہت کچھ تو وہی ہے۔ بہت کچھ نیا نیا سا بھی ہے۔‘‘

آغا سہیل کی رہائش گاہ واقع ایف۔ سی کالج میں دونوں گاڑیاں ساتھ ساتھ پہنچیں۔ اُن کے بیٹے محسن سے پہلی بار ملاقات ہوئی۔ باپ سے کچھ زیادہ ہی اونچا اور صحت مند نظر آیا۔ اس نے آگے بڑھ کر سلام کیا، ہاتھ ملایا اور میرا سامان بشیر کی مدد سے اُتروا کر اندر لے گیا۔ ہم سب ایک کھلے کھلے اور خوب صورتی سے سجے ہوئے ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے۔ آغا سہیل اندر چائے کا انتظام کرنے چلا گیا تھا۔ پھر اس کی آواز بھی سنائی دی۔ وہ فون کر رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا، ’’آئیے، آپ کو اپنے ایک دیرینہ رفیق سے ملاؤں۔‘‘

اُس طرف احمد ندیم قاسمی تھے۔ جمعہ کی وجہ سے گھر پر تھے۔ ایک مدت کے بعد (۱۹۴۲ء کے بعد) میں نے ان کی آواز سنی، اتنے قریب سے۔ اِس شہر میں مجھے سب سے پرانے جاننے والوں میں ایک وہ تھے، دوسرے میرزا ادیب۔ میرزا ادیب صاحب سے بھی پہلی ملاقات دہلی میں ۱۹۶۱ء میں پہلی ہند و پاک ثقافتی کانفرنس میں ہوئی تھی۔ قاسمی صاحب نے پوچھا، ’’کب آئے؟‘‘

میں نے بتایا، ’’بس ابھی آ کر بیٹھا ہوں۔‘‘

’’خوش آمدید! سب خیریت ہے نا؟ کب ملو گے؟‘‘

’’جی شکریہ! جس وقت آغا سہیل لے کر آئیں گے، حاضر ہو جاؤں گا۔‘‘

’’اچھا، کیا پروگرام ہے؟‘‘

’’میں آج ہی رات کو ملتان چلا جاؤں گا۔ وہاں کل میرے ایک دوست کی شادی کا ولیمہ ہے۔‘‘

کچھ باتیں اور بھی ہوئیں۔ پھر میں جلدی جلدی گرم پانی سے نہا کر اور کپڑے بدل کر ڈرائنگ روم میں آ بیٹھا۔ سہیل صاحب کی بیگم اور ان کے بچوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ بہت سے پروگرام طے ہونے لگے لیکن کوئی پروگرام نہ بن سکا۔ آخر فیصلہ یہی ہوا کہ میں آج رات سے پہلے کہیں نہیں جاؤں گا اور ملتان سے لوٹ کر ہی سب سے ملوں گا۔ سب لوگ چائے پی کر اور رخصت لے کر چلے گئے۔

معانی و اشارات

واہگہ	-	واگھا، پنجاب کا سرحدی مقام
عملہ	-	کسی محکمے کے ملازم، کام کرنے والے کارکن
اپرنٹس (Apprentice)	-	باقاعدہ ملازمت سے قبل تربیت حاصل کرنے والا
خراد مشین	-	لوہے یا لکڑی کو چھیل کر صاف کرنے کی مشین، لیتھ مشین
پل باکس	-	ریل کی پٹریوں کے قریب زمین پر لگے باکس جو ضروری تکنیکی کاموں کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔
کھیس	-	چادر، رضائی، گدّے کا خول

مشقی سرگرمیاں

* شبکی خاکہ مکمل کیجیے۔

لاہور کے مضافات میں

* لاہور پہنچ کر رام لعل جن ادیبوں سے ملے، ان کے ناموں کا شبکی خاکہ بنائیے۔

* ذیل کی سرگرمیاں ہدایات کے مطابق مکمل کیجیے۔

ا۔ ماضی سے متعلق مصنف کے خیالات بیان کیجیے۔
٢۔ ٹرین کی کھڑکی سے نظر آنے والے مناظر بیان کیجیے۔
٣۔ ٹرین سے اُترنے کے بعد پلیٹ فارم کا منظر بیان کیجیے۔
٤۔ ''خوابوں کے سامنے سرحدیں اور فاصلے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔'' اس جملے کی وضاحت کیجیے۔
٥۔ مصنف اور احمد ندیم قاسمی کی گفتگو اپنے الفاظ میں لکھیے۔
٦۔ ''نقل مکانی مجھے وراثت میں ملی ہے۔'' اس جملے کی روشنی میں مصنف کے ہجرت کے کرب کو اپنے لفظوں میں بیان کیجیے۔
٧۔ مصنف نے جو پنجابی زبان کا جملہ ادا کیا ہے، اسے نقل کیجیے۔

* آغا سہیل کے سوال ''لاہور کو کچھ بدلا ہوا پایا؟'' کے جواب میں مصنف کے خیالات اپنے لفظوں میں قلم بند کیجیے۔

* ہدایت کے مطابق قواعدی سرگرمی مکمل کیجیے۔

ا۔ نقل مکانی مجھے وراثت میں ملی ہے۔ (اس جملے میں مبتدا اور خبر پہچانیے)
٢۔ بہت کچھ تو وہی ہے۔ (منفی جملے میں تبدیل کیجیے)